SALMAN KHURSHID

Letters

٦ جولائی ۲۰۰۲

مکرمی و محترمی جناب پروفیسر محمد عمر میمن صاحب،

آداب

آپ کے خط مورخہ ۲٦ جولائی کا بہت شکریہ۔ بے حد شرمندہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی مگر اس کا سبب سپریم کورٹ میں اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق وہ مقدمہ تھا جو ہندستان میں اقلیتی اداروں کے مستقبل پر اثر انداز ہوگا۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ گزشتہ برس کے مقالوں میں سے پانچ اہم مقالات آپ نے شاملِ اشاعت کیے اور اس برس کی کانفرنس کی رپورٹ اور میرے خطبۂ استقبالیہ کو شاملِ اشاعت کرنے کا فیصلہ کیا۔

آپ نے اپنے گزشتہ خط میں بھی اور ۲٦ جولائی کے خط میں بھی ایک بہت اہم اور مناسب سوال بار بار اٹھایا ہے جس کی طرف آپ نے اپنے خطوط میں گزشتہ برس بھی اُس وقت اشارے کیے تھے جب میں نے آپ کو مقالات اشاعت کے لیے روانہ کیے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر آپ کی رائے سے مکمل اتفاق ہے مگر میرا خیال یہ ضرور ہے کہ آپ کی رائے کے پس منظر اور اردو لسانی اقلیت کے سیاسی حالات اور ذہنی تناظر میں جو سماجی محرکات کارفرما ہیں ان کا سنجیدہ اور علمی تجزیہ ہونا چاہیے۔ آپ کا گزشتہ خط آنے کے بعد میں نے آپ کے مجلّے کے لیے اس موضوع پر ایک مضمون بھی لکھنا شروع کیا تھا، پھر جب یک لخت یہ طے کیا کہ اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اردو کے احیا کی تحریک کے تسلسل میں عملاً ایک سیاست داں کے طور پر شامل رہوں تو پھر مضمون بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ اب مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں اپنے معروضات پیش کروں۔ ایک سطح پر مجھے اس امر سے مکمل اتفاق ہے کہ AUS کو ہندستان میں اردو کے فروغ (جس کا یقیناً ہر زاویہ سیاسی ہے، کہ یہ موضوع ہی سیاسی ہے) سے متعلق اُس انداز کی علمی تحریریں شائع نہیں کرنی چاہئیں جو میں نے روانہ کی تھیں۔ مگر میرا زاویۂ نظر آپ سے مختلف اندازِ فکر یا یوں کہیے کہ تجربات پر مبنی ہے۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ میرے تمام خیالات سراسر غلط ہوں مگر میں نے اردو کے معاملے کو جس طرح سمجھا ہے اس پر آپ سے رہ نمائی چاہتا ہوں۔ اگر ہندستان میں AUS کے دو تین خریدار ہیں تو پھر یہ سوال بالکل درست ہے کہ ہندستان میں اردو کی صورتِ حال پر اس مجلّے میں کچھ بھی کیوں شائع ہو۔ ہندستان میں اردو اشرافیہ کا اردو

کے تئیں جو رویہ ہے اس میں AUS کے یہ دو تین خریدار بھی کیسے بنے، مجھے تو اس پر بھی تعجب ہے کیوں کہ ہندستان کی اردو اشرافیہ جس طرح بے حس، مفاد پرست اور بے خبر ہے میں اس کا کبھی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے مجھے اس امر سے اصولاً اتفاق ہے کہ آپ ہندستان میں اردو زبان اور تعلیم کے سوال پر کوئی تحریر شائع نہ کریں تو اس کا اخلاقی جواز ہے، مگر چوں کہ آپ اس نوعیت کی تحریریں شائع کرتے ہیں (اسی لیے مجھے آپ کو گزشتہ برس کچھ مضامین بھیجنے کی ہمت ہوئی) جس کا سبب اردو کے فروغ (کے مقصد) سے آپ کی وابستگی ہے۔ میں سماجیات کا طالب علم نہیں ہوں مگر مجھے اس امر میں دلچسپی ضرور ہے کہ ہندستان کا اردو اشرافیہ اور اردو مسلم دانش ور جس ذہنی پستی کا شکار ہیں کیا اس کی کوئی اور مثال بھی تاریخ میں موجود ہے؟ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اردو اشراف اور مسلم دانش وروں کے ذہن کے قریب سے مطالعے کا موقع ان چار برسوں میں ہی ملا جب اس کانفرنس کے لیے میری ان سے خط و کتابت ہوئی۔ کانفرنس کو اولاً ۱۹۹۹ میں منعقد ہونا تھا مگر یہ ہر دفعہ ملتوی ہوتی رہی، جس کی سب سے بڑی وجہ اعلا درجے کے مقالات کی کمی تھی۔ گزشتہ برس جب کچھ اچھے مقالات موصول ہوئے تو ۲۶ جنوری کی صبح گجرات میں قیامت خیز زلزلہ آگیا، جس کی وجہ سے کانفرنس کو ایک برس کے لیے اور ملتوی کرنا پڑا، مگر چوں کہ غیرملکی مندوبین آگئے تھے یوں ایک دن کا جلسہ ۸ فروری کو کردیا۔ البتہ اِس برس چار روز کی بھرپور کانفرنس ہوئی جس میں اردو اشرا ف [مراد اردو پروفیسرز، اردو اداروں کے سربراہ، مسلمانوں کے نام پر (اردو کی بھی) وقتاً فوقتاً سیاست کرنے والے، مسلم دانش ور] کا اس کانفرنس میں کوئی کنٹریبوشن نہیں۔ اردو دنیا سے آئے بھی چند ہی لوگ اور اکثر مباحث کے نام پر بے سر پیر کی باتیں کر کے، یا یوں کہیے کہ اپنی حاضری درج کرا کر، چلے گئے۔ کانفرنس میں اصل کنٹریبوشن ان غیرمسلم اسکالرز کا رہا اردو جن کے کسی مفاد کے حصول میں معاون نہیں۔ بعض غیرملکی اسکالرز کے مقالے البتہ بہتر تھے مگر اس کے لیے ہمیں جس درجہ محنت کرنا پڑی وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ شاید غیرملکی اسکالروں کے ذہن میں بھی یہ بات گھر کر گئی ہے کہ ہندستان میں اردو کے متعلق سیمنار اور مشاعرے ایک ہی طرح کی تفریحی چیزیں ہیں۔ اس کے لیے یقیناً اردو والوں کے علاوہ کوئی اور ذمے دار نہیں۔ کانفرنس کے زمانے میں بھی اردو والوں نے کئی عجیب و غریب حرکتیں کیں، مگر اول تو انھیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ مجھے اس نفسیات سے واقفیت ہی نہیں جو ہندستان میں اردو اشراف کی فطرتِ ثانیہ ہے، دوم سیمنار کے لیے تمام وسائل (تقریباً ۷۰ لاکھ روپیے) جن ذرائع سے حاصل کیے گئے تھے، وہ نہ تو اردو والوں کے ذرائع تھے اور نہ ہی مسلمانوں کے۔ جن لوگوں نے مجھ سے شکایت کی کہ انھیں مقالات پڑھنے کا موقع نہیں ملا ان کو میں نے بہت دیانت داری سے ایک ہی جواب دیا کہ جو لوگ چار برس میں ایک مقالہ لکھنے کے لیے چار روز سنجیدگی سے جم کر نہیں بیٹھ سکتے انھیں کوئی بین الاقوامی کانفرنس میں کیوں بلائے گا۔

آپ کے سوال کا ایک اور پہلو ذرا مختلف زاویہ لیے ہوئے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب میں عبرانی سے متعلق کانفرنس میں ہندستان کے ماہرینِ تعلیم کو کوئی نہیں بلائے گا۔ مگر یہودی ایک زندہ قوم ہیں اور انھوں نے اردو سے کہیں زیادہ خراب حالات میں اپنی زبان کو

زندہ رکھا۔ ان کی نفسیات اور زندہ رہنے کا جذبہ بھی ہندستان کے اردو والوں سے مختلف ہے۔ پھر ہندستان میں سوال غلامی کی اس روایت کا بھی ہے جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ اولاً یہاں جب تک گوری چمڑی والے نہ ہوں کسی بھی موضوع کی کانفرنس کے اعلا پائے کا ہونا مشکوک ہوتا ہے۔ مگر اس سے بھی بڑی مجبوری یہ ہے کہ ہمارے لوگ کوئی سنجیدہ تحریر اردو کے موضوع پر سپردِ قلم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مجھے آپ سے اس امر پر بھی مکمل اتفاق ہے کہ ہندستان میں اردو تعلیم کے موضوع پر مغربی اسکالرز بہت کم جانتے ہیں، مگر ہمارے اپنے اسکالرز جس درجہ سہل پسند ہیں اس میں عافیت کی کوئی اور راہ نہیں۔ ہماری سہل پسندی اور اخلاقی زوال کے سبب ہماری علمی دنیا پر عموماً بھی مغرب کی اجارہ داری ابھی شاید بہت دیر تک قائم رہے گی اور مغربی اسکالروں کے ''علمی کام'' کے لیے تیار شدہ مواد تھالی میں رکھ کر پروسنے کا ذریعہ اردو کے سیاق و سباق میں آپ کے علمی مجلّے کے سوا دوسرا نہیں۔ ہندستان میں انگریزی داں اسکالروں کو موضوع سے واقف کرانے کے لیے میں نے ہندستان میں انگریزی کے مقتدر جریدوں مثلاً EPW اور MAINSTREAM سے درخواست کی کہ وہ اردو کے موضوع پر کانفرنس سے متعلق تحریریں شائع کریں اور اردو کا درد رکھنے والے مگر واقفِ حال اعلا درجے کے اسکالر-مدیر کی حیثیت سے آپ سے درخواست کی کہ کچھ تحریریں AUS میں بھی شائع ہوں تو اچھا ہو۔ آپ نے ازراہِ نوازش میری درخواست کو پذیرائی کا شرف بخشا۔ اس کا اجر آپ کو اللّٰہ دے گا اور اردو والوں کی تاریخ آپ کی شکر گزار ہوگی۔

کیا میں آپ سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ اپنے بے حد قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر ایک نظر مقالہ نگاروں پر ڈالیں اور ایک ہی نشست میں ہم رشتہ چار تحریروں کو ملاحظہ فرما کر میری رہ نمائی فرمائیں کہ میں کس حد تک غلط ہوں۔ اس نظر سے کہ جس کے لیے میں درخواست گزار ہوں، ان تحریروں کے ایک ہی نشست میں مطالعے کے بعد شاید آپ انھیں بھی شائع کرنے کا ذہن بنالیں۔ آپ کے لیے میں نے خطبۂ استقبالیہ کا اردو متن خاص طور پر تیار کیا ہے۔ اسے علاحدہ مضمون بھی کہا جاسکتا ہے۔ حسبِ حکم اصل خطبۂ استقبالیہ کا انگریزی متن بھی حاضرِ خدمت ہے۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص
سلمان خورشید

*

مکرمی،

اس خط کے توسط سے میں آپ کے مقتدر مجلّے کے ان قارئین کی توجہ ــ جن کی اکثریت مغربی دانش گاہوں کے ان اسکالرز کو محیط ہے، جن کی دلچسپی کے موضوعات اردو زبان و ادب اور ہندستان کی اردو داں یعنی عمومی طور پر مسلم آبادی کے سماجی، اقتصادی اور عمرانی رویے ہیں ــ ان زاویوں کی طرف دلانا چاہتا ہوں، جو ہندستان میں اردو کے مسائل کے خلقیے میں ہیں۔ میری اس تحریر کی محرک وہ مراسلت ہے جو امریکہ اور مغربی

ممالک کی دانش گاہوں کے تقریباً ان تمام اسکالرز اور خود ''سالنامہ دراساتِ اردو'' کے مدیر سے ہوئی ہے جس میں ان امور کی طرف توجہ دلائی گئی جن کا تجربہ مجھے گزشتہ چار برسوں میں اپنے طور پر بھی ہوا۔

میں نے اپنی تعلیم قانون کے طالب علم کے طور پر اوکسفرڈ سے مکمل کی اور چند برسوں تک وہاں قانون کا درس بھی دیا۔ ہندستان واپس آنے کے بعد چند ماہ وزیرِاعظم اندرا گاندھی کے دفتر سے وابستہ رہا، پھر استعفیٰ دے کر وکالت شروع کی اور ۱۹۸۹ میں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اغلب ہے کہ باقی زندگی سیاست اور وکالت کے کوچوں ہی میں گزرے گی۔ اردو سے میری وابستگی صرف اتنی ہے کہ میں نے سینٹ اسٹیونس کالج میں پہلی دفعہ بی۔ اے۔ میں اردو ادب کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا بلکہ یوں کہا جائے کہ مجھے وہاں اردو کے استادوں نے ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اس سے پہلے ایک برس ابتدائی درجات میں کبھی پٹنہ کے سینٹ زیورس اسکول میں اردو پڑھی تھی اور کچھ دن گھر پر مولوی صاحب سے جو دراصل قرآن پڑھانے آتے تھے۔ میں نے اردو ادب کا مطالعہ ایک مضمون کے طور پر مگر کبھی نہیں کیا تھا، یعنی واضح طور پر اردو ادب کے طالب علم کے طور پر میری استعداد صفر تھی، اور مجھے اس پر خاصا تعجب تھا کہ آخر مجھے اردو ادب پڑھنے کی ترغیب کیوں دی جا رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب اس امر پر تھا کہ اسٹیونس کالج جیسے مقتدر ادارے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ جس طالب علم نے باقاعدہ بارہویں درجے تک اردو نہیں پڑھی ہے اسے اردو پڑھنے کی اجازت دے دی جائے۔ کسی دوسرے مضمون میں اسٹیونس کالج میں یہ امر تقریباً ناممکن تھا۔ اردو کے استاد نے کہا کہ میرے اردو پڑھنے سے کالج میں اردو کو فروغ ملے گا کیوں کہ اسٹیونس کالج میں اکثر طلبہ (یقیناً مسلم طلبہ) اردو کو اختیار نہیں کرتے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں گئے بغیر اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پورے انہماک سے اردو پڑھنے یعنی لوہے کے چنے چبانے کے بعد ایم۔ اے۔ میں انگریزی کی طرف مڑ گیا۔ بی۔ اے۔ میں میرا آنرس انگریزی میں تھا۔ پھر ایک برس بعد ایم۔ اے۔ انگریزی کو ادھورا چھوڑ کر قانون پڑھنے اوکسفرڈ چلا گیا۔ اس کے بعد کے تمام برسوں میں اردو سے میرا رابطہ اس کے ادب خصوصاً شاعری کے ایک قاری کے طور پر رہا، مگر محدود۔

۱۹۶۶ میں مرے نانا ڈاکٹر ذاکر حسین کی صد سالہ تقریبات کا جشن حکومتِ ہند نے منایا۔ میں اس وقت حکومتِ ہند میں وزیرِ مملکت برائے امورِ خارجہ تھا اور میرے والد کرناٹک کے گورنر نیز جامعہ ملّیہ کے چانسلر تھے، مگر پھر بھی جشن بھونڈے پن کے ساتھ صرف سرکاری خانہ پری کے طور پر اختتام پذیر ہوا۔ اس لیے ذاکر صاحب کے دوستوں (جن کی باقیات ابھی جامعہ اور علی گڑھ میں ہے) اور افرادِ خانہ نے فیصلہ کیا کہ ذاکر صاحب کی یاد میں ایک بڑا علمی جشن منعقد کیا جائے۔ طے ہوا کہ جشن کے روایتی طریقے سے انحراف کرتے ہوئے ایک بین الاقوامی کانفرنس اردو پر منعقد کی جائے کہ ذاکر صاحب نے ۱۹۵۲ میں اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان قرار دینے کے لیے ایک مہم کے تحت ۲۲.۵ لاکھ دستخطوں پر مشتمل ایک محضر صدرِ جمہوریۂ ہند کو پیش کیا تھا، یوں اردو کے حوالے سے کانفرنس کا انعقاد ذاکر صاحب کو بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔ بعد میں کانفرنس

کا خاکہ بننے کے بعد لفظِ ''اردو'' کو اردو تعلیم تک محدود کیا گیا تا کہ موضوع کی مرکزیت قائم رہے۔ اس میں بھی ذریعۂ تعلیم اور اختیاری مضمون دونوں کی الگ الگ شقیں بنائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس کانفرنس میں صرف وہی اسکالر شرکت کریں گے جو ان موضوعات پر رہ نما مگر علمی تحریریں سپردِ قلم کر سکیں۔ کانفرنس کی تاریخ ۸ فروری ۱۹۹۹ طے کی گئی۔ کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوتے ہی مجھے انڈین نیشنل کانگریس کے صوبائی صدر کے طور پر ہندستان کے سب سے بڑے اور اردو کے حوالے سے سب سے اہم اور حسّاس صوبے اتر پردیش کی ذمے داری سونپ دی گئی جو گزشتہ سو برسوں سے بھی زیادہ سے اردو مخالف فسطائی ہندی قوتوں کی ان سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے جو ہندو شناخت کے نام پر ہندتوا قوتوں کی سیاسی اساس ہیں۔ داستان طویل ہے مگر کئی بار کے التوا کے بعد آخرش کانفرنس ۸ تا ۱۱ فروری ۲۰۰۲ کو منعقد ہو سکی اور ان چار برسوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ اردو کی صورتِ حال ''زمین'' پر کیا ہے۔ سب سے اہم تجربہ اردو اشراف اور نام نہاد مسلم دانش وروں کی علمی اور عملی دونوں طرح کی فہمِ عالیہ اور صلاحیتوں کا ہوا۔

کانفرنس کی تیاریوں کے ابتدائی ایام میں میں نے ایک مضمون "Dying Urdu Needs a Kiss of Life" کے عنوان سے لکھا جو قدرے قطع و برید کے ساتھ ہندستان میں ''ٹائمز آف انڈیا'' اور پاکستان میں ''دی نیشن'' میں شائع ہوا۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے عام قارئین نے مضمون کے مختلف زاویوں پر بحث کی مگر خود کو اردو کے ٹھیکے دار سمجھنے والوں، زمینی حقیقتوں سے بے خبر بند کمروں میں نام نہاد علمی بحثیں کرنے والوں کے لیے ــ جن کی روزی روٹی اور شناخت کا واحد وسیلہ معاملات و مسئل کو سمجھے بغیر ''اردو'' کی رٹ لگاتے رہنا ہے ــ یہ تعجب کی بات تھی کہ مضمون ایک ''سیاست داں'' نے لکھا۔ بعد میں جب میں نے کانفرنس سے متعلق خط و کتابت کی تو مجھے بعض اردو اسکالروں کی علمی استعداد اور اردو سے متعلق اس عمومی فہم کا بھی اندازہ ہوا جس کی وجہ سے اردو ہندستان میں اپنی تاریخ کے بد ترین دور سے گزر رہی ہے۔ ہندستان میں اردو دانش ور کہلانے والے بالعموم دو طرح کے لوگ ہیں: ایک وہ جن کا پیشہ درس و تدریس ہے اور جن کی اکثریت کو اس امر کا کوئی اندازہ نہیں کہ زبان کا معاشرے میں کیا رول ہو سکتا ہے، اور اردو جن حالات سے ہندستان میں دوچار ہے ان میں اس کی حیثیت کیا ہے، اردو لسانی اقلیت کے عمومی معاشی حالات کے تناظر میں اردو سے متعلق قوانین کیا ہیں اور ان کا عملی نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اردو ادب کے ان استادوں نے ہندستان میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں اپنے لیے Ex-offico Leader کا رول خود ہی تفویض کر کے یہ بھی فرض کر لیا کہ وہ چوں کہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں اس لیے اردو سے متعلق ہر مسئلے پر بولنا ان کا پیدائشی حق ہے اور اردو سے متعلق ہر کام صرف انھیں سے پوچھ کر کیا جائے۔ حکومتِ ہند نے بھی آزادی کے بعد ان کے اس رول کو تسلیم کر لیا تھا۔ حکومت اور اردو والوں کے اس رویے نے ہندستان میں اور خصوصاً شمالی ہند میں اردو کی تباہی میں فیصلہ کن رول ادا کیا۔ اردو کی ٹھیکے داری کے دعوے داروں کا دوسرا گروپ رٹائیرڈ مسلم بیوروکریٹس پر مشتمل ہے جن کی اکثریت اپنے دورانِ ملازمت حکومت کو کھلے عام اردو مخالف مشورے دیتی رہی اور واشگاف الفاظ میں اردو تعلیم کی مخالفت کرنے میں ان

حضرات نے کبھی کوئی تکلف نہیں کیا۔ ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کی طرف سے منعقدہ مذکورہ کانفرنس کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو کے ہر قسم کے ٹھیکے داروں کے بھرم کو خاک میں ملا کر اردو کے مسئلے پر سنجیدہ گفتگو اور قابلِ قبول پالیسیوں کی راہ ہموار کی۔

اردو کی حمایت میں سرکاری مسلمانوں کے اس جرگے نے صرف اس وقت ــ اور وہ بھی حکومت کے ایما پر ــ لب کشائی کی جب کسی سیاسی مصلحت کے تحت حکومت کو اردو کے نام پر مسلمانوں کے استحصال کرنے کی ضرورت ہوئی؛ مگر سرکاری ملازمت سے رٹائرمنٹ کے بعد ان بیوروکریٹس کی اکثریت جس طرح شیروانیاں پہن کر مشاعروں کی صدارت کرنے اور اردو کے مسائل پر حکومت کو میمورینڈم پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہے، وہ اس مجموعی زوال کا اعلانیہ ہے جس سے تہذیبی طور پر اردو بولنے والے من حیث القوم نبرد آزما ہیں۔ میرے اپنے تجربے کی حد تک پورے ہندستان میں اردو اور مسلمانوں کی سیاست کے دعوے داروں میں صرف ایک سیاست داں اور گنتی کے دو یا زیادہ سے زیادہ تین اسکالروں کو ان امور کی فہم ہے کہ ہندستان کے عمومی سیاسی حالات کے تناظر میں اردو زبان و تعلیم کا احیا اس طور پر کس طرح ہو سکتا ہے کہ اردو زبان کی تعلیم کا نظم عملاً ممکن ہو۔ عملاً سے مراد واضح طور پر یہ ہے کہ اردو تعلیم کے نظم یعنی اردو کے احیا کی بات عام ہندو کے ذہن میں کسی طرح کا خوف پیدا نہ کرے کیوں کہ مسلم سیاست کے عمومی رویے کو قبول کرنا نہ تو عام ہندستانی کے لیے ممکن ہے، اور نہ ہی مسلم اشراف اور سیاست دانوں کی اردو کے نام پر کی جانے والی منفی سیاست ہندی مسلمانوں کے لیے سود مند ہو سکتی ہے، اور نہ ہی مشاعروں فلموں اور یونیورسٹی سطح کی اردو تعلیم کے ذریعے بھی اردو کا احیا ممکن ہے۔ سیاسیات کے ماہرین میں اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ آج ہندو فرقہ واریت کی فیصلہ کن قوت منفی مسلم سیاست کا نتیجہ ہے۔ اردو کے مسلم حسّیت کا ایم ترین زاویہ ہونے کے سبب ہی مسلم سیاست دانوں کی دلچسپی کا مرغوب موضوع اردو ہے، مگر اردو کے حقوق کے مطالبے کے لیے ان کا انداز وہی ہے جو شاہ بانو اور بابری مسجد کے معاملے میں تھا کہ انھیں اس سے دلچسپی نہیں کہ عوامی سطح پر اردو کی تحریک کیسے شروع کی جائے، عدالتی چارہ جوئی کس طرح ہو، اور اس کے اثراتِ مابعد کیا ہوں گے، بلکہ ان کی اصل دلچسپی اس میں ہے کہ اردو کا مسئلہ ان کی سیاست کو کس حد تک فروغ دے سکتا ہے۔ اردو کے احیا کی بات کرتے ہوئے عام ہندو پر ہونے والے ردّ عمل کو بھی مسلم دانش ور نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آج ہر مسلم دانش ور دینی مدارس کے ذریعے اردو کے تحفظ کی بات اور دینی مدارس کی جدید کاری کا مطالبہ ایک ہی سانس میں کر رہا ہے۔ واضح طور پر نہ تو مسلمان حکومت کے ذریعے دینی مدارس کی جدید کاری کو قبول کریں گے اور نہ اردو کا احیا دینی مدارس میں ممکن ہے۔ انگریزی جاننے والے مسلم سیاسئین اور دانش ور اکثر یہ کام انگریزی مضامین کے ذریعے کرتے ہیں کیوں کہ وہ جن لوگوں یعنی اربابِ اقتدار کو اردو کی سیاسی قوت اور ہندستان کی مسلم سیاست میں اپنے رول سے واقف کرانا چاہتے ہیں، ان کو صرف انگریزی آتی ہے اور عام اردو داں کو ان کی اردو کش پالیسیوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ایسے سیاست داں باہمی طور پر مسلم امت سے متعلق کسی سنجیدہ مسئلے پر بھی کبھی متفق نہیں

ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی امور پر بھی نہیں۔ ہمارے علماء بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس سیاق و سباق میں بر سبیلِ تذکرہ اور عبرت ناک مثال پاکستان کی جسٹس منیر کمیٹی ہے جو پاکستان میں پہلی مرتبہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے پنجاب کے ایک حصے میں ہوئے پہلے فسادات کے بعد قائم ہوئی اور تمام بڑے علماء اس کے سامنے گواہ کے طور پر پیش ہوئے اس (سیاسی) امر پر تو تمام علماء متفق تھے کہ احمدیہ غیر مسلم ہیں مگر مسلمان ہونے کی کوئی ایک ایسی تعریف نہ تھی جس پر کوئی دو علماء متفق ہوں۔

ان تمام تفصیلات کے ذکر سے میرا مقصد اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے کہ ہندستان میں اردو کے فروغ کی سیاست کن محرکات کے تابع ہے۔ یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ جو لوگ آزادی کے بعد اردو کی سیاست کرتے رہے ہیں وہ اردو کے مسئلے کی پیچیدگی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، اور ایسے حالات سیاست دانوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہوتے ہیں۔ مگر ان حالات کی وجہ سے اردو کا زبان کے طور پر جس طرح زوال ہوا، اردو کی تعلیم جو اردو کے عظیم سرمایے سے واقفیت کے لیے لازمی تھی، اس کا نظام جس طرح اردو دانش وروں کے معمولی مفادات کے لیے ان کی خودغرضی کے سبب تباہ ہوا، اس نے ہندستان کے اردو معاشرے کو تہذیبی پستی کے اس قعر میں پہنچا دیا جہاں قوموں کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ ہندستان کے اردو داں معاشرے میں یہ صورتِ حال سنجیدہ عمرانیاتی مطالعے کی متقاضی ہے۔

[نامکمل]